دس نمبر کا سوال

ناہید سلطان اختر

وارڈ میں داخل ہوتے ہی میری نظر دروازے کے عین مقابل اس بیڈ پر پڑی جو صبح دس ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ بھائی کا فریضۂ تیمارداری بھابی کو سونپ کر میرے گھر جاتے وقت تک خالی تھا مگر سہ پہر کو میری واپسی پر وہاں ایک مریضہ شمیل کے چاکلیٹی شلوار قمیض میں ملبوس اکڑوں بیٹھی اپنے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد باندھے خائف نظروں سے چہار اور دیکھ رہی تھی۔ اس کا سر ننگا تھا۔ شانے اوڑھنی سے بے نیاز۔ اپنی

جسامت سے وہ بہ مشکل اٹھارہ، انیس برس کی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر دنداسے کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا اور دونوں ابروؤں کے بیچ گہرے کاہی رنگ کا ایک ستارہ نما ٹیٹو گدا ہوا تھا۔ وہ انتہائی چوکنی بیٹھی تھی۔ جیسے ابھی کوئی خبر ملے گی اور وہ بستر سے چھلانگ لگا کر بگٹٹ دوڑ لے گی۔ میں نے اسے ایک نظر دیکھا اور اس نے اپنے تمام تر چوکنے پن کے ساتھ مجھے......

''امراضِ قلب کے وارڈ میں وہ بھلا کیا کر رہی تھی۔'' میں چپ چاپ یہ سوچتی بھائی کے بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔ جس کے تین اطراف پردے تنے ہوئے تھے اور سرہانے دیوار تھی۔

دو دن قبل میں اپنی زندگی کے وحشت ناک ترین تجربے سے گزری تھی۔ اس روز بھائی حسب معمول گھر سے نکلے تھے اور دس منٹ سے بھی کم وقت میں بھائی کا موبائل فون نمبر میرے موبائل فون کی اسکرین پر تھا۔

''ہیلو......!'' میں نے بہت اطمینان سے کال ریسیو کی۔

''ہاں...... میری طبیعت کچھ خراب ہوئی ہے، ڈاکٹر کے ہاں ہوں۔'' بھائی کی آواز مجھے بہت دور سے آئی اور ڈوبی، ڈوبی سی محسوس ہو رہی تھی اور میرا وجود سرتا پا لرز رہا تھا۔ گھر پر میرے اور بھابی کے سوا کوئی تیسرا فرد نہیں تھا۔ میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور ہم دونوں اندھا دھند گھر سے نکلیں۔

''ہارٹ اٹیک......!'' مقامی کلینک کے ڈاکٹر کی تشخیص تھی اور اس نے بھائی کو فوراً قریب ترین اسپتال پہنچانے کی ہدایت کی۔

عام حالات میں، میں اپنے پیاروں کے بارے میں بہت کمزور اور رقیق رہتی ہوں مگر ہنگامی حالات میں خدا عجیب قوت دے دیتا ہے۔ بھاگم، بھاگ اسپتال پہنچے اور ایمرجنسی میں موجود ڈیوٹی ڈاکٹرز نے بھائی پر حملۂ قلب کی توثیق کے ساتھ ہی شعبۂ امراضِ قلب سے کسی سینئر معالج کے لیے کال دی۔ سینئر معالج کو بلانے کے لیے جانے والا اسپتال کا باوردی اہلکار رجسٹر ہاتھ میں لیے روانہ ہوا اور میں اس کے ساتھ، ساتھ دوڑتی چلی گئی۔ سربراہ شعبۂ امراضِ قلب اپنے ایک دوسرے ساتھی کے ہمراہ وارڈ کے راؤنڈ پر تھے۔ میں ہاتھ جوڑتی، گڑگڑاتی ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''پلیز......! پلیز ڈاکٹر صاحب...... جلدی کریں۔ وہ میرا بھائی، میرا بیٹا سب کچھ ہے...... پلیز......! فار گاڈ سیک۔''

''چلتے ہیں بی بی...... چلتے ہیں......'' لہجے میں ویسی ہی ناگواری تھی۔

''پلیز......! اسے کچھ ہو گیا تو......'' جملہ ادھورا رہا میں دونوں ہاتھ جوڑے اپنے ہونٹوں سے لگائے گڑگڑا رہی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔

''او کے...... او کے......''

سربراہ شعبہ اور ساتھی ڈاکٹر راؤنڈ ادھورا چھوڑ کر میرے ساتھ چل پڑے۔ مردانہ قدموں کا ساتھ دینا مجھے مشکل تھا مگر میں تقریباً دوڑ، دوڑ کر ان کے ساتھ چل رہی تھی۔ ساتھی ڈاکٹر نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''ایزی...... ایزی...... اللہ پر بھروسا رکھیں۔ بھائی کو کچھ نہیں ہوتا...... سب ٹھیک ہوگا۔''

''انشا اللہ......'' میرے دل نے کہا۔

بھائی کو ایمرجنسی سے شعبۂ نگہداشتِ قلب میں منتقل کر دیا گیا۔ اگلے چند گھنٹے ایک ناقابلِ بیان آزمائش کی صورت گزرے...... سربراہِ شعبہ کے ساتھی ڈاکٹر حقیقی معنوں میں مسیحا ثابت ہوئے۔ بھائی کے خاطر خواہ علاج کے ساتھ اہلِ خانہ کو ان کی تسلیاں اور دلاسے حوصلے کا باعث بنے رہے۔

خطرہ ٹل گیا...... پُرآشوب گھڑیاں گزر گئیں۔ مگر دل بے ایمان ہو چکے تھے۔ بھائی کی عیادت کو آنے والوں کا تانتا اور تیمارداری کے لیے ایک

کے بعد دوسرے کی بڑھ چڑھ کر خدمات..... پہلی رات ایک تیماردار بھائی کے سرہانے اور تین وارڈ کے باہر موجود رہے۔

دوسرا دن تھا۔ طبیعت کافی سنبھل چکی تھی۔ میں گھر ہو کر اسپتال واپس پہنچی تو وارڈ میں داخل ہوتے ہی میری نظر اس دوشیزہ پر پڑی جو بیڈ پر اکڑوں اور چوکنی بیٹھی غزال آنکھوں سے چہار اور تک رہی تھی۔ اسے اچٹتی نظر سے دیکھ کر میں بھائی کے سرہانے جا کر بیٹھی تو مجھے برسوں پہلے والدہ مرحومہ کی علالت کے دوران اسپتال میں لائی جانے والی وہ نوجوان لڑکی یاد آ گئی جسے سینے میں شدید درد کی شکایت کے ساتھ اس کے گھر والے انتہائی پریشانی میں اسپتال لے کر آئے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ اپنی پسند کے لڑکے سے شادی کرنا چاہتی تھی اور گھر والوں نے اس کا رشتہ کہیں اور کر دیا تھا۔ لڑکی نے خود پر حملۂ قلب طاری کرنے کی کوشش کی تھی مگر ڈاکٹرز نے اس کی اس کوشش کو ناکام کر دیا اور خواب آور انجکشن لگا کر اسے اسپتال سے رخصت کیا۔ میرے ذہن نے امراضِ قلب کے وارڈ میں بیٹھی اس چوکنی دوشیزہ کے ڈانڈے برسوں پرانے اس واقعے سے ملانے کی کوشش کی۔

شام گہری ہو گئی۔ بتیاں جل اٹھیں، نائٹ شفٹ کا اسٹاف ڈیوٹی پر آ چکا تھا۔ مریضوں کو کھانا دے دیا گیا۔ سینئر ڈاکٹر نے وارڈ کا راؤنڈ لیا، مریضوں کو دیکھا۔ جونیئر ڈیوٹی ڈاکٹرز کو مریضوں کی بابت ضروری ہدایات دیں۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد مریضوں کے بیڈز کے اردگرد پردے تن گئے اور تیمارداروں نے بیڈز کے ساتھ بڑی چھوٹی، چوبی بنچوں پر اپنے بستر جمانا شروع کر دیے۔ وارڈ نیم تیرگی میں ڈوب گیا اور سناٹا چھا گیا۔ گزشتہ دو راتوں کی طرح میں نے وارڈ کے ایک گوشے میں عشا کی نماز ادا کی اور بھائی کے بیڈ کے نزدیک چوبی بینچ پر آ بیٹھی۔ گزشتہ دو راتوں کی طرح نیند کے دور، دور تک کوئی آثار نہ تھے۔ بھائی کو واش روم جانے کی حاجت ہوئی، میں نے سہارا دینا چاہا مگر انہوں نے حسبِ عادت مردانگی کا مظاہرہ کیا۔ میں نے وارڈ بوائے سے آہستہ سے درخواست کی کہ بھائی واش روم سے نکلیں تو وہ انہیں سہارا دے دے۔

کوئی دس بجے لگ بھگ ڈیوٹی نرس نے بھائی کے بیڈ کے اردگرد تنے پردوں سے اندر جھانکا اور انہیں سوتا دیکھ کر مجھ سے آہستگی سے بولی۔

"کیا آج بھی رات بھر جاگیں گی؟"

"نیت تو ہے۔" میں نے دبی دبی آواز میں کہا۔

"سوتی کیوں نہیں...... اب تو آپ کے مریض کی حالت اطمینان بخش ہے۔" وہ مسکرا دی۔

"امتحان چھوٹا ہو یا بڑا...... ہمیشہ میری نیند اڑا دیتا ہے اور یہ تو بہت ہی کٹھن امتحان ہے میرے لیے۔"

"مریضوں کو تو ہم ٹرینکولائزرز دے کر سلاتے ہیں مگر اکثر تیماردار تو ٹرینکولائزرز کے بغیر ہی مریضوں سے زیادہ گہری نیند سوتے ہیں۔"

"خدا کی دین ہے۔"

نرس مسکرا دی اور پلٹ گئی۔

ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ وارڈ کے سناٹے میں کسی مریض کے کراہنے کی دھیمی، دھیمی درد آمیز صدا شروع ہوئی، کچھ آوازیں سی سنائی دیں۔ شاید کراہنے والے مریض کو نرس یا ڈیوٹی ڈاکٹر نے آ کر دیکھا ہو پھر یہ آواز تھم گئیں۔ مگر کراہنے کی آواز مسلسل آتی رہی بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ اس کے درد و آہنگ میں شدت آتی چلی گئی پھر کراہنے کے ساتھ مسلسل ایک لفظ کی تکرار بھی سنائی دینے لگی۔

"گولی...... گولی...... گولی......" آواز نسوانی تھی۔

میں بہت دیر سنتی رہی پھر اٹھنے پر مجبور ہو گئی۔ آواز کے تعاقب میں اسی بیڈ تک جا پہنچی جہاں شام کو میں نے وارڈ میں آنے والی اس نوجوان مریضہ کو اکڑوں بیٹھے انتہائی سراسیمہ نگاہوں سے چہار اور

تکتے دیکھا تھا۔ وہ اس وقت بھی بیٹھی تھی اور وحشت بھری نظروں سے چہار اور دیکھتے ہوئے مسلسل کراہ رہی تھی اور ایک ہی لفظ کی گردان کر رہی تھی۔

''گولی...... گولی...... گولی......'' اس نے اپنا پیٹ دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔ اب سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ جب کسی آزمائش میں ناکامی ہمارا مقدر ٹھہرے تو عقل پر کیونکر پردے پڑ جایا کرتے ہیں۔ خدا شاہد ہے اس کی زبان سے گولی کی گردان نے مجھے ایک لمحے کو بھی یہ سمجھنے سے قاصر رکھا کہ وہ تکلیف رفع کرنے والی گولی طلب کر رہی تھی۔ اس کے بیڈ کے نزدیک اسی کی طرح گوری چٹی ہم شکل مگر بڑی عمر کی عورت کھڑی بے تابی سے کبھی اس کا کندھا دبانے لگتی، کبھی دھیرے، دھیرے اس کے زانو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دلاسا دینے لگتی۔ اس کے چہرے سے پریشانی کے ساتھ ناقابلِ بیان کرب ہویدا تھا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ وہ اپنی بیمار کے لیے کیا کرے کہ اسے چین آ جائے۔ مریضہ کے سرہانے لگا مانیٹر ابنارمل اعداد دکھا رہا تھا۔

''یہ آپ کی کون ہے......'' میں نے دوسرے مریضوں کی نیند میں خلل نہ ڈالنے کی خاطر بہت دھیمی آواز میں تیماردار خاتون سے پوچھا۔

''یہ امارا بچی ہے۔'' جواب ملا۔

''کیا تکلیف ہے؟'' میرا یہ سوال احمقانہ تھا۔ امراضِ قلب کے وارڈ میں وہ قلب کی مریضہ ہی ہو سکتی تھی۔

''دل کا تکلیف ہے۔'' جواب آیا۔

''کب سے ہے تکلیف......؟''

''آٹھ سال سے۔''

''پہلے علاج کرایا؟''

''ہاں.... ہولی فیملی۔''

''پھر......؟''

''ان لوگ نے اِدھر بھیجا ہے۔''

''آئے کہاں سے ہو آپ لوگ؟''

''حسن ابدال۔''

مریضہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ''گولی...... گولی......'' کی گردان کرتی رہی۔ میں نے مریضہ کے پائنتی دھری فائل پر درج اندراجات دیکھے۔ خولہ زوجہ زرگل عمر ستائیس سال...... فائل کھولنے سے قبل میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ کسی صورت وہ اٹھارہ، انیس سال سے زائد نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے چہرے پر نوعمر بچیوں کی سی معصومیت تھی۔

''گولی...... گولی......'' اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔

''آپ نرس کو جا کر بتائیں آپ کی پیشنٹ کی طبیعت خراب ہے۔'' میں نے تیماردار خاتون سے کہا۔

''بولا تھا...... گولی دیا تھا۔'' میں نے مانیٹر کی طرف دیکھا۔ بلڈ پریشر، دل کی دھڑکن سب ابنارمل تھا۔ نرسز اسٹیشن کی طرف دیکھا۔ وارڈ کے عین وسط میں شیشے کا کمرا نیم تیرگی میں تھا، میں اس کمرے کی طرف بڑھی بند دروازے پر ٹھٹک کر اندر کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ سینئر ڈیوٹی نرس ایک کرسی پر بیٹھی دوسری پر اپنی ٹانگیں پھیلائے شانوں سے پیروں تک سفید چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ جونیئر نرس قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھی محوِ استراحت تھی۔ میں نے شیشے کے بند دروازے پر دستک دی۔ جونیئر نرس کلبلائی۔ دروازے کی سمت دیکھا، اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر جھانکتے ہوئے مخمور آواز میں بولی۔ ''کیا بات ہے؟''

''وہ...... سسٹر...... بیڈ نمبر بارہ کی پیشنٹ کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔'' میں نے کہا۔

''اسے دوا دے دی تھی۔'' نرس نے کہا۔

''مگر وہ بہت تکلیف میں دکھائی دیتی ہے۔''

''میں کیا کر سکتی ہوں...... ہارٹ پیشنٹ کو ہم ڈاکٹر کی مرضی کے بغیر کوئی دوا نہیں دے سکتے۔''

نرس کی بات معقول تھی۔ دل کو لگی۔

"آپ دیکھ تو لیں......"

نرس با دلِ ناخواستہ شیشے کے کمرے سے نکلی۔ بیڈ نمبر بارہ تک گئی۔ مریضہ سے کہا۔ "بی بی لیٹ جاؤ......سونے کی کوشش کرو۔" مریضہ کچھ اس طرح منہ پھاڑ پھاڑ کر جیسے اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی ہو۔ کہتی رہی۔ "گولی......گولی......"

"سو جاؤ......" نرس نے پھر کہا۔ "دوسرے مریض تمہاری آواز سے ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔"

مریضہ کی آنکھوں میں ان کہی وحشت تھی۔

نرس دوبارہ اسی شیشے کے کمرے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے سوچا سینئر نرس کو جگاؤں مگر یہ خیال مانع رہا کہ کہیں وہ نیند میں خلل پڑنے پر خفا نہ ہو۔ ایک نظر مریضہ کو دیکھتی میں اپنی جگہ پر واپس جانے کو پلٹی۔

"گولی......گولی......" درد میں ڈوبی صدا نے میرا تعاقب کیا۔ میں اپنی جگہ پر واپس آ بیٹھی۔

مریضہ کے کراہنے اور گاہے گاہے "گولی...... گولی......" کی صدا کافی دیر اسی طرح جاری رہی...... پھر یہ صدا بتدریج دھیمی پڑنے لگی۔ "گولی......گولی......" کی گردان رک گئی۔ کراہنے کی آواز کم ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ رک گئی۔ میں نے اسے مریضہ کو آرام آ جانے پر محمول کیا......اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ گھڑی میں وقت دیکھا۔ پونے چار کا عمل تھا۔ فجر کی اذان ہونے میں کوئی سوا گھنٹا باقی تھا۔ اسپتال کی راتیں کتنی طویل ہوتی ہیں اور دل دکھانے والی بھی...... میں تہجد کے نوافل ادا کرنے کی غرض سے وضو کرنے واش روم میں چلی گئی۔ وضو کر کے نکلی تو میں نے ڈیوٹی پر موجود سینئر نرس کو تیزی سے اس طرف جاتے دیکھا۔ جہاں تین وارڈ بوائز کو میں تین راتوں سے ہر رات پہلو بہ پہلو سوتے دیکھتی تھی۔ نرس نے ایک وارڈ بوائے پر تنی چادر کا کونا جھک کر جھنجوڑا۔ نرس نے کچھ کہا۔ وہ اور اس کے ساتھ سوئے باقی دونوں نوجوان بھی یک لخت اٹھ بیٹھے۔

نرس وارڈ کے انتہائی مغربی کونے میں واقع اس کمرے کی طرف لپکی جہاں سے میں نے گزشتہ دو دنوں میں جونیئر ڈاکٹرز کو آتے جاتے اور کھانے کے اوقات میں اسپتال کے اہلکاروں کو کھانا اندر لے جاتے دیکھا تھا۔ نرس کمرے میں گئی اور ذرا سی دیر میں دو نوجوان ڈاکٹر خوابیدہ آنکھوں کے ساتھ کمرے سے نکل آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں اسٹیتھو اسکوپ بھی تھا۔ سب کے سب آگے پیچھے بیڈ نمبر بارہ کی طرف لپکے۔ میں تہجد کے لیے وضو کیے دم بخود مریضہ کے سرہانے لگے مانیٹر کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بیڈ کے عین اوپر چھت سے لگی مرکری لائٹ روشن ہو چکی تھی۔

تختے کی دیوار کے اس پار بیڈ نمبر بارہ کے گرد اس وقت وارڈ کا تمام عملہ موجود تھا۔ دونوں ڈاکٹرز اس پر جھکے ہوئے تھے۔ اتنے انہماک سے جیسے اس وقت اس بیڈ پر موجود مریضہ ان کے لیے کائنات کی اہم ترین چیز تھی۔ کچھ دیر بعد دونوں سیدھے کھڑے ہو گئے اور انہوں نے سینئر نرس سے کچھ کہا۔ سینئر نرس نکلی اور اس کے ساتھ، ساتھ اس کی جونیئر بھی...... ایک الماری کھول کر انہوں نے اس میں سے دو سفید چادریں نکالیں اور تیزی سے بیڈ نمبر بارہ کی طرف بڑھیں۔

تکلیف کی شدت سے اکڑا ہوا جسم سیدھا کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ رات بھر اذیت میں گزارنے والی مریضہ اب پُرسکون ہو چکی تھی۔ مُردہ جسم کو ایک سفید چادر میں لپیٹ دیا گیا۔ مریضہ کی تیمار دار صدمے کی کیفیت میں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

"کوئی اور تمہارے ساتھ ہے؟" میں نے سینئر نرس کو تیمار دار عورت سے پوچھتے سنا۔

عورت جس کی آنکھوں میں اب وہی وحشت اتری ہوئی تھی جو میں نے مریضہ کی آنکھوں میں

دیکھی تھی اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بلاؤ......" تیمار دار عورت وحشت اور صدمے کی کیفیت میں باہر گئی۔

نرس ہزندگی کی حد پار کر جانے والی مردہ عورت کو ڈھاٹا باندھنے لگی۔ مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا لگ رہا تھا۔

تیمار دار عورت ایک نوجوان مرد کے ساتھ لوٹ آئی۔ مرد نے ایک بچہ گود میں اٹھا رکھا تھا جس کا سر اس کے شانے پر تھا۔ بچہ نیند میں تھا۔ مرد نے بیڈ کے نزدیک پہنچ کر پھٹی، پھٹی آنکھوں سے بیڈ پر پڑی مردہ عورت کو دیکھا...... اور اپنی ایک آنکھ ہاتھ کے انگوٹھے سے دوسری ایک انگلی سے دبالی۔ پھر چشم زدن میں اس نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا اور بولا۔

"ایمبولینس مل جائے گی۔" اس کی آواز مجھے دنیا کے دوسرے کنارے سے آتی لگی۔

ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک وارڈ بوائے سے کچھ کہا جو میں سن نہ سکی۔ غالباً اس نے وارڈ بوائے کو اس شخص کے ہمراہ جانے اور ایمبولینس کا بندوبست کرنے کی ہدایت کی تھی۔ مذکورہ شخص نے بچہ اپنی گود سے تیمار دار عورت کے سپرد کر دیا۔

"یہ آپ کی کون تھی؟" دونوں میرے نزدیک سے گزرے تو میں نے اس شخص سے پوچھا۔

"بیوی!" اس نے بیڈ پر پڑے مردہ جسم کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ پھر اس نے میرے پوچھے بنا خود ہی تیمار دار عورت کے شانے سے لگے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "وہ میرا بیٹا ہے۔"

"کتنے بچے ہیں تمہارے؟"

"ایک......!" اس شخص کی آنکھوں میں بے تحاشا سرخی امنڈ آئی۔ پھر وہ لمبے، لمبے ڈگ بھرتا وارڈ بوائے کے ہمراہ وارڈ سے باہر نکل گیا۔

وارڈ میں سناٹا تھا۔ اِکا دُکا مریضوں کے سوا سب سو رہے تھے اور اسی طرح مریضوں کے تیمار دار بھی...... اور جو جاگ رہے تھے وہ دم بخود یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ مرنے والی کو ڈھاٹا باندھ کر اسے سرتا پا چادر سے ڈھانپ دینے کے بعد دونوں نرسیں اور ڈیوٹی ڈاکٹرز شیشے کے کمرے میں جا بیٹھے۔ سینئر نرس کے چہرے پر اپنے فرض سے غفلت اور خجالت کا احساس تھا۔ جونیئر نرس اسے کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ ڈیوٹی ڈاکٹرز میں سے ایک جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو کی تفسیر بنا ہوا تھا جبکہ دوسرا اپنی بائیں کہنی کرسی کے ہتھے پر ٹیک کر اپنی ہتھیلی کے ہالے میں ٹھوڑی دبا کر سر جھکائے یوں بیٹھ گیا تھا جیسے گہرے دکھ میں ہو...... مرنے والی کا بچہ حال و مستقبل کی ہر فکر سے بے نیاز اپنی نانی کے سینے سے لگا اس کے کندھے پر سر رکھے سو رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے میرا دل کٹنے لگا۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ کس قدر المناک سانحے کا شکار ہو چکا تھا۔ موت کا بے رحم ہاتھ اس کے سر سے وہ مہربان ہاتھ کھینچ لے گیا تھا جس نے اسے زمانے کے گرم و سرد سے اور لوگوں کی دست برد سے محفوظ و مامون رکھنا تھا۔

"اس معصوم کو کون بتائے گا کہ اس کی ماں نے اپنی زندگی کی آخری رات کتنی تکلیف اور اذیت میں گزاری تھی۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

"گولی...... گولی......" کی کرب آمیز صدا میری سماعت میں ابھر رہی تھی ڈوب رہی تھی۔

رات بھر لمبی تان کر سونے والے وارڈ بوائز سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ان کے چہروں پر فرض سے غفلت کا احساس اور شرمساری تھی۔

مسجدوں سے اذانِ فجر کی صدائیں بلند ہونے لگی تھیں۔ میں بھائی کے بیڈ کی جانب پلٹی۔ مصلیٰ اٹھایا اور وارڈ کے اس مخصوص گوشے میں قیام و سجود کے لیے جا کھڑی ہوئی جہاں میں گزشتہ دو دن نماز ادا کرتی رہی تھی۔

نماز کے دوران مجھے وارڈ میں لوگوں کی آمد و رفت اور کچھ ہلچل کا احساس ہوتا رہا تھا۔ نماز کی

ادائیگی کے بعد رب کریم کے حضور دست دعا اٹھانے سے قبل میری نظر بیڈ نمبر بارہ کی طرف اٹھی۔ بیڈ خالی تھا...... مجھے گزشتہ شام اسی بیڈ پر اس کے اکڑوں بیٹھ کر ہراساں نظروں سے چہار اور تکنے کا منظر یاد آگیا......تو موت اس کے تعاقب میں تھی۔

دفعتاً اک احساس جرم نے مجھے آ دبوچا۔

دو دن قبل بھائی کو اٹیک ہونے پر میں کس بری طرح بولائی، بولائی پھری تھی۔ ایمر جنسی میں موجود ڈیوٹی ڈاکٹر کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر میں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا تھا۔

"پلیز......! پلیز ڈاکٹر...... پہلے میرے پیشنٹ کو دیکھ لیں۔" مجھے روتے گڑگڑاتے دیکھ کر ڈیوٹی ڈاکٹر فوراً ہی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شعبۂ امراض قلب سے سینئر ڈاکٹر کو کال دینے پر میں کس وحشت کے عالم میں کال رجسٹر...... لے کر جانے والے اہلکار کے ساتھ اس سے بھی ایک قدم آگے دوڑتی چلی گئی تھی۔ سربراہ شعبہ اور ان کے ساتھی ڈاکٹر میرے گڑگڑانے اور رونے پر میرے ساتھ، ساتھ ایمرجنسی میں چلے آئے تھے۔ بھائی کو آناً فاناً وارڈ میں شفٹ کیا گیا تھا۔ خون کو پتلا کرنے والا انجکشن لگایا گیا تھا۔ جس کا متبادل ہم نے دس منٹ کے اندر، اندر کیمسٹ سے خرید کر اسپتال کو فراہم بھی کر دیا تھا۔ سب کچھ کس قدر عجلت اور میکانکی انداز میں ہوا تھا۔ اور اسی وارڈ میں ایک معصوم بچے کی نوجوان ماں رات بھر "گولی...... گولی......" کی دہائی دیتی مر گئی تھی۔

مجھے یوں لگا جیسے وارڈ کا عملہ ہی نہیں میں بھی اپنے فرض سے غفلت کا شکار ہوئی تھی۔ مانیٹر کی ریڈنگز ابنارمل دیکھ کر مجھے سینئر نرس کو جھنجوڑ کر جگانا چاہیے تھا۔ ڈیوٹی ڈاکٹر زہی کو خواب غفلت سے نہیں جگانا چاہیے تھا بلکہ مریضہ کی بگڑی حالت کے پیش نظر سینئر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے زمین آسمان ایک کر دینا چاہیے تھا اور اگر اسے زندگی بچانے والی کسی دوا کی ضرورت تھی اور اسپتال ایسی دوا کی فراہمی سے قاصر تھا مجھے بھاگ کر باہر سے دوا خرید لانی چاہیے تھی۔ مرنے والی کی جگہ میرا اپنا کوئی پیارا ہوتا تو کیا میں یہ سب کچھ نہ کرتی۔ کیا رات بھر اسے اس اذیت میں مبتلا رہنے دیتی۔

میرا سارا وجود لرز رہا تھا۔ جائے نماز پر بیٹھی میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے رو رہی تھی۔ عرقِ ندامت رس رہا تھا۔

"دس نمبر کا سوال...... دس نمبر کا سوال......"

میرا ضمیر مجھے کچوکے دے رہا تھا۔ دس نمبر کا سوال تھا جو گزری رات نے میرے سامنے رکھا تھا۔ میں نے سوال پرچہ خالی ہی لوٹا دیا تھا۔ صفر میرا مقدر بن گیا تھا۔ میں فیل ہو گئی تھی۔

بھیگی آنکھوں سے میں نے شیشے کے کمرے کی طرف دیکھا...... نرسیں...... ڈاکٹر سب مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے اور وارڈ کے ایک گوشے میں تینوں وارڈ بوائز دوبارہ اپنی، اپنی جگہوں پر لیٹ چکے تھے۔ شاید اس لیے کہ ابھی باہر تیرگی تھی...... ان کی نیند شاید بھری نہیں تھی۔

انہیں تو شاید ہر روز دس نمبر کا سوال ملتا ہوگا...... مجھے تو زندگی میں پہلی بار دس نمبر کا سوال ملا تھا۔ مجھے ان پر رشک اور اپنی بے بضاعتی پر افسوس محسوس ہونے لگا۔ مرنے والی کی تو بہر حال آئی تھی مگر اس کی واپسی کے سفر میں قدرے آسانی فراہم کر کے اپنی، اپنی جگہ ہم سب ناکامی کے اس ملال سے تو بچ سکتے تھے جو اس وقت ان سب کے چہروں ہی کو دھواں، دھواں نہیں کیے ہوئے تھا بلکہ میرے اپنے دل کو بھی نارسائی اور ناکامی کے احساس سے دوچار کیے دے رہا تھا۔

دس نمبر کا سوال تھا اور مجھ سمیت تمام امیدوار ہی اس امتحان میں فیل ہو گئے تھے۔